© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی صحبت میں ہم نے ہندوستانی سیاست کے جن مہمات مسائل کی طرف اشارات کیے تھے، سلسلۂ کلام کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین کے حافظہ میں ان اشارات کو پھر تازہ کردیں۔

سب سے پہلے ہم نے یہ بتایا تھا کہ بیسویں صدی میں حکومت کا تصور، انیسویں صدی اور اس سے پہلے کے تصورات سے اصلاً مختلف ہوگیا ہے۔ قدیم تصور کے مطابق حکومت ایک خاص دائرے میں محدود رہتی تھی، اور باشندوں کے تمدنی، معاشی اور تعلیمی معاملات سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن جدید تصور کی رو سے وہ تمام پرانی حدیں ٹوٹ گئی ہیں، جو اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی تھیں۔ اب حکومت، زندگی کے ہر شعبے میں دخیل ہوتی ہے، اور اپنی فیصلہ کن طاقت سے پوری حیات اجتماعی کے نقشے کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔ لہٰذا اس دور میں حکومت کے نظام، اسکی نوعیت اور اسکے اصول کا مسئلہ در اصل ایک قوم کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر کسی قوم پر ایسا نظام حکومت مسلط ہو جائے جو اسکے مزاج قومی اور اسکے اصول تہذیب و تمدن سے مناسبت نہ رکھتا ہو تو وہ قوم بحیثیت ایک قوم ہونے کے زندہ نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہ سکتی، کیونکہ نظام حکومت دیکھتے دیکھتے اسکی زندگی کا نقشہ بدل کر کچھ سے کچھ کر دیگا۔

اس کے بعد ہم نے یہ حقیقت ذہن نشین کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان میں اس وقت جس نظام حکومت کا نشوونما ہو رہا ہے، وہ دراصل اسی انگریزی حکومت کا ایک بچہ ہے، جو گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی مدت میں ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کی صورت کو بہت کچھ بگاڑ چکی ہے۔ بظاہر نظام حکومت ہیں جو کچھ تغیر و تبدل ہو رہا ہے، وہ محض فروعی ہے ورنہ دراصل ڈھانچہ وہی کا وہی ہے جو انگریزوں نے بنا دیا ہے، اور صرف ڈھانچہ ہی نہیں، بلکہ اسکے بنیادی تصورات اور اسکے فکری اصول بھی وہی ہیں جن پر انگریزی سلطنت کی اساس قائم ہے۔

اس سلسلہ میں ہم نے خصوصیت کے ساتھ تین اہم ترین اصولوں کی طرف اشارہ کیا تھا جو انگریزی نظریات سیاسی سے اخذ کر کے ہندوستان کے نظام حکومت میں پیوست کیے جا رہے ہیں، یعنی وطنی قومیت — ڈیماکریسی کا انگریزی ماڈل — حکومت کا پارٹی سسٹم۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ حکومت کا کوئی ایسا نقشہ نہیں سوچ سکتا جو ان تین اصولوں سے خالی ہو۔ ہندو قوم اپنی اغراض کی خاطر مجبور ہے کہ ان اصولوں کی پرزور حمایت کرے، کیونکہ یہ اسکو ہندوستان کا مالک لاشریک لہا بنا سکتے ہیں، اور کوئی قوم فرشتہ نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہ کرے جو اسکے مفاد کی بہترین خدمت کرتی ہو۔ لیکن مسلمانوں کیلیے، اور ہندوستان کی دوسری قوموں کیلیے جو اپنی مستقل حیثیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہوں، اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی کہ وہ ان اصولوں کو قبول کریں، اور ان پر جدید نظام حکومت کے ارتقاء کو گوارا کرلیں، (اس میں خود مددگار بننا تو حماقت نہیں غداری ہے)۔ اسلیے کہ ان اصولوں پر جو حکومت قائم ہو گی اس میں ہندوستان کی ساری آبادی کیلیے تہذیب، تمدن اور معیشت و معاشرت کے نقشے بنانے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بگاڑنے کی پوری طاقت صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو گی، اور وہ خواہ کتنی ہی فیاضی و رواداری سے کام لیں، بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ قانون سازی، تنفیذ قانون، عدالت، اور تعلیم کا جو نظام بالکل انکے زیر اثر ہوگا، اسکی کارگزاری، مدسے مد پچاس برس کے اندر مسلمانوں اور تمام دوسری قوموں کے امتیازی وجود کو فنا کر دیگی۔

اسکے بعد ہم نے مذکورۂ بالا اصولِ ثلثہ پر فرداً فرداً بحث شروع کی تھی، اور سب سے پہلے ان فتنوں کو بیان کیا تھا جو ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم بنانیکی کوشش، بلکہ انکو ایک ہی قوم فرض کر لینے سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس اصل خبیث کی چند ہی شاخوں کا ہم ذکر کرنے پائے تھے کہ قلت گنجائش کے سبب سے سلسلۂ بیان منقطع کر دینا پڑا۔ اب ہم آگے بڑھنے سے پہلے پھر اسی کی چند اور شاخوں کی طرف اشارہ کرینگے۔

وہ اسی قومیت کے مفروضہ کو حقیقت بنانیکی خواہش تھی جس نے پنڈت جواہر لال نہرو کو علامۂ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے مقابلہ میں قادیانیت کی حمایت پر آمادہ کیا تھا، اور جسکی بدولت ''قوم پرستوں'' میں اس مت کی ہمت افزائی کا جذبہ روز افزوں ہے، حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ قادیانی گروہ انگریزی امپیریلزم کا بہت چہیتا بچہ ہے۔ بظاہر یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ''سامراج شکن'' اور ''ترقی پسند'' حضرات کا ان ''سامراج پرستوں'' اور ''رجعت پسندوں'' سے کیا رشتہ؟ اور ایک پنڈت کو متکلم اسلام کی حیثیت اختیار کرنیکی کیا ضرورت؟ اور اس مسئلہ سے اسکو کیا دلچسپی کہ کونسا گروہ دائرۂ اسلام کے اندر ہے اور کونسا باہر؟ لیکن ذیل کا اقتباس پڑھ کر آپکی حیرت، عبرت سے بدل جائیگی۔ ابھی کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر شنکر داس نے اخبار ''بندے ماترم'' میں لکھا تھا۔

''ہندوستانی قوم پرستوں کو اگر کوئی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے تو وہ احمدیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تحریک ہے - یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان جسقدر احمدیت کی طرف راغب ہونگے اسی قدر قادیان کو مکّہ تصور کرنے لگیں گے اور آخر کار قوم پرست بن جائینگے مسلمانوں میں اگر کوئی تحریک عربی تہذیب اور پان اسلامزم کا خاتمہ کر سکتی ہے تو وہ یہی احمدی تحریک ہے ...... جس طرح ایک ہندو کے مسلمان بن جانے پر اسکی شردھا اور عقیدت رام، کرشن، وید، گیتا اور رامائن سے اٹھ کر حضرت محمدؐ صاحب، قرآن مجید اور عرب کی بھومی میں منتقل ہو جاتی ہے، اسی طرح جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے تو اس کا زاویۂ نگاہ بھی بدل جاتا ہے - حضرت محمدؐ میں اسکی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور جہاں پہلے اسکی خلافت عرب میں تھی، اب وہ قادیان میں آجاتی ہے ...... ایک احمدی، خواہ دنیا کے کسی گوشے میں بھی ہو، روحانی تشنگی حاصل کرنے کیلیے وہ اپنا منہ قادیان کی طرف کرتا ہے۔"

یہ چند فقرے "قوم پرست" کے ضمیر کو بالکل بے نقاب کر دیتے ہیں - ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ "جغرافی قومیت" کا مفاد، اسلام کے مفاد کی عین ضد واقع ہوا ہے - اسلام کا مفاد اس میں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک عالمگیر مرکز سے وابستہ ہوں، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک قبلہ کے محور پر گھومیں - اسکے بالکل برعکس جغرافی قومیت کا مفاد یہ چاہتا ہے کہ ہر جغرافی خطّہ کا مسلمان اس عالمگیر مرکز و محور سے اپنا تعلق منقطع کر کے، اپنے ہی وطن میں اپنی عقیدت کا مرکز پیدا کرے، یعنی مسلمان کے بجائے "قوم پرست" بن جائے - لہذا ہندوستان کا "قوم پرست" کم سے کم جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک کا مسلمان اگر ہردوار کی نہیں تو قادیان ہی کی جاترا کرے، رام و کرشن سے نہیں تو مرزائے قادیانی ہی سے عقیدت کا رشتہ جوڑے (جو ہمیں بینی کرکے پہلے ہی اپنے آپ کو کرشن جی کا اوتار قرار دے چکے ہیں) وید اور گیتا کو نہیں تو مرزا صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی کے الہامات کو قرآن سے بدل لے ——— یہی چیز ہے جسکی بنا پر ہم پیشگوئی کر سکتے ہیں کہ قادیانی گروہ انگریزی امپیریلزم کا جیسا چہیتا متبنّیٰ رہا ہے، عنقریب اس سے زیادہ چہیتا متبنّیٰ ہندوستانی قوم پرستی کا بن جائیگا ۔

لیکن قوم پرستی کی تبلیغ کے نتائج اس سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔ وطنی قومیت کی طرف رجحان پیدا ہوتے ہی انسان کے زاویۂ نگاہ میں جو عظیم الشان تغیر واقع ہو جاتا ہے، اسکی نہایت بیّن مثالیں ہمکو اس لٹریچر میں ملتی ہیں جو آجکل مسلم نژاد ہندوستانی قوم پرستوں کے قلم سے نکل رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ترکی قوم پرست، اسلامی روایات کو چھوڑ کر عہد جاہلیت کی ترکی روایات کی طرف رجوع کرنے لگا ہے، بالکل اسی طرح ہندوستانی قوم پرست بھی زمانۂ قبل اسلام کے ہندوستان سے روحانی تحریک د) حاصل کرتا ہے، اور اسلامی تہذیب کے نمائندوں کو چھوڑ کر ہندوستانی تہذیب کے نمائندوں کی طرف عقیدت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اب وہ ہندوستان کو خطاب کر کے یوں کہتا ہے :

دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دینگے ہم

اب وہ قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار ہو کر یہاں تک کہہ گزرتا ہے :۔

جل رہے تھے محفلوں میں جسکی ویدوں کے چراغ
ہوں اُجاگر جن سے بھارت کے سپوتوں کے دماغ

وہ کرشن اور اسکی بنسی کی صدائیں چار سو
گیان کی گیتا کہ ہو ہر آتما کو آرزو

خاکدان ہند سے گوتم اٹھا نانک اٹھا
صاحبِ عرفان تھا اک اک فرد اپنے وقت کا

ہند کی اس خاک سے کیا کیا رشی پیدا ہوئے
کیسے کیسے حکیم دار جن سے جری پیدا ہوئے

کیا کہیں اُس عہدِ زرّیں کی حقیقت کیا کہیں
دہر میں ثانی ہوئی تھی اپنی عظمت کیا کہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہند کی راہوں میں اوروں کے قدم آ کے نہ تھے
ہاں ابھی اہلِ عرب اہلِ عجم آسئے نہ تھے

تک رہی تھیں دور سے اغیار کی نظریں اسے
چاہتے تھے سب یہی تسخیر ہم کر لیں اسے

اس مضمون کی متعدد نظمیں رسالہ "ہمایوں" لاہور مورخہ فروری ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی ہیں اور سب کے مصنف مسلمان خاندانوں کی پیداوار ہیں۔ ایسی نظموں کی لَے اب برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

ہندوستانی قومیت اگر بنیگی تو یہ اس کا نقشہ ہوگا۔ لیکن اسکے بننے سے پہلے ہی ہمارے "قوم پرست" لیڈروں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ بن چکی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ کہہ رہے ہیں کہ کسی فرقہ کو اپنی علحدہ سیاسی تنظیم نہ کرنی چاہیے، کیونکہ جب وہ ایک ہی قوم کے "فرقے" ہیں تو انکی مستقل سیاسی تنظیم کے معنی "تفرقے" کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ گاندھی جی کے مقابلہ میں کوئی مسلمان، مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہی نہیں کر سکتا، کیونکہ گاندھی جی تو پوری "قوم" کے نمائندے ہیں۔ وہ جو کچھ فرمائیں، لامحالہ وہی "قوم" کے اس حصے کی آواز بھی ہوگی جو مسلمان کہلاتا ہے۔ اسکے خلاف اگر کوئی مسلمان کچھ کہے تو وہ قابلِ التفات نہیں۔ حال میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ایک ممتاز رکن ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا صاحب نے فرمایا کہ:-

"یہ ایک مشتبہ امر ہے کہ آیا مسٹر جناح اسی طرح مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے مجاز ہیں جس طرح مہاتما گاندھی پوری ہندوستانی قوم کی طرف سے بول سکتے ہیں۔ ۔۔۔۔۔ کُل اپنے جزو پر آپ سے آپ مشتمل ہوتا ہے۔ مہاتما گاندھی کُل کے نمائندے ہیں، اسلیے وہی اس جزو کے مفاد کا بھی تحفظ کرتے ہیں جبکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نمائندگی مسٹر جناح کر رہے ہیں" (ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۳۸ء)

گویا یہ مفروضہ اب یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ کل میں مسلمان مدغم ہو گئے اور انکی کوئی علحدہ آواز باقی نہیں رہی۔ اب اگر کسی طرف سے کوئی علحدہ آواز آتی ہے تو وہ غول بیابانی کی آواز ہے۔ مسلمان کل سے الگ ہے کہاں جو وہ بولے گا!

اسی مفروضہ کی بنا پر ایک جماعت نے اپنے آپ کو "قوم" کا اجارہ دار قرار دے لیا ہے۔ جو بات وہ چاہیں طے کر لیں، وہی گویا "پوری قوم" کی آواز ہے۔ اگر تمام مسلمان ملکر بھی اسکی مخالفت کریں، تب بھی اسکی بات اپنی جگہ "قومی" ہی رہتی ہے۔ اسکی نہایت روشن مثال نہرو رپورٹ ہے جسے مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیت العلماء، غرض مسلمانوں کی تمام جماعتوں نے بالاتفاق رد کر دیا تھا، مگر پھر بھی اسکی حیثیت ایک "قومی مطالبہ" ہی کی رہی اور اسے یہی کہکر برٹش گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا کہ اس "قومی مطالبہ" کو ایک سال کے اندر منظور کرو ورنہ ہم لڑینگے۔

نہرو رپورٹ دریائے راوی میں غرق ہو گئی، مگر وہ مفروضہ جس پر اسکی بنا رکھی گئی تھی اپنی جگہ بدستور قائم ہے۔ چنانچہ مسٹر سوباش چندر بوس ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں کہ:

"ہم ہر اس تصفیہ کو قبول کر لینگے جو اصولِ قومیت سے مطابقت رکھتا ہو"

اس ارشاد کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ راشٹرپتی جی نے صرف پہلا قضیہ بیان فرمایا ہے یعنی یہ کہ کوئی تصفیہ اس وقت تک قابلِ قبول نہیں جب تک کہ مسلمان اپنی مستقل قومیت سے دست بردار ہو کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو گم نہ کر دیں۔ اسکے بعد دوسرا قضیہ جو منطقی طور پر پہلے قضیہ سے خود بخود پیدا ہوتا ہے، انہوں نے حذف فرما دیا، یعنی یہ کہ جب مسلمان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود ہی "قوم" میں اپنا گم ہو جانا قبول کر لینگے تو تصفیہ کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہیگا، کیونکہ "قوم" سے الگ انکا وجود ہوگا کہاں کہ وہ کچھ بولیں اور ان سے کسی امر کا تصفیہ کیا جائے۔ قوم خود قوم سے کب تصفیہ کیا کرتی ہے؟ اور اگر بالفرض ان کے کچھ شوریدہ سر افراد نے بولنے پر اصرار ہی کیا تو "قوم" کے اجارہ دار جس بات کو نہ ماننا چاہینگے اسکے متعلق انہی کی زبان سے "قوم" کہدیگی کہ میں —— اور اس "میں" میں مسلمان بھی بالتبع شامل ہونگے —— اس بات کو نہیں مانتی!

اسی مفروضہ کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ جداگانہ انتخاب منافی قومیت ہے، اور سرکاری ملازمتوں میں تناسب کا سوال بھی قومیت کے خلاف ہے، اسلیے کہ جب ایک ہی قوم ہندوستان میں رہتی ہے تو الگ الگ انتخاب کے کیا معنی، اور ملازمتوں میں یا اسٹیٹ کے دوسرے ذمہ دارانہ مناصب میں متناسب تقسیم کا کیا سوال؟ ساری قوم کے مسائل ایک ہی سے ہیں۔ ان کا تصفیہ اگر ہندوؤں نے کر دیا تو کیا اور مسلمانوں نے کر دیا (جس کا امکان دو چھوٹے چھوٹے صوبوں کے سوا اور کہیں نہیں ہے) تو کیا۔ سرکاری محکمے اور "قوم" کی پوری زندگی کو متاثر کر دینے والے مناصب اگر سب کے سب ہندوؤں سے بھر گئے تب بھی کوئی نقصان تو نہ ہوا، آخر "قوم" ہی میں تو رہے۔ اور اگر (بفرض محال بلکہ اس ضروری شرط کے ساتھ کہ ایسا ہونا محال ہو) مسلمانوں سے لبریز ہو گئے تو بھی بہر حال قوم سے باہر نہ گئے۔

یہ مفروضہ درحقیقت ایک دودھاری تلوار ہے۔ اگر حقیقت میں یہ مفروضہ کے بجائے امر واقعی بن جائے، تب تو اسکے معنی ہندوستان کی سرزمین سے اسلام کے کلّی استیصال کے ہیں۔ لیکن جب تک یہ امر واقعی نہیں بنتا، اس وقت تک یہ مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے دبانے اور کچلنے، اور ان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوت اور منفعت کی ہر جگہ سے محروم کر دینے، اور انکی تہذیب و تمدن کو رفتہ رفتہ مٹانے کیلئے ایک بے پناہ ہتھیار ہے، تاکہ آخر کار ان کیلیے دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کیے بغیر چارہ نہ رہے: یا تو وہ اپنے آپ کو "قوم" میں اس طرح تحلیل کر دیں کہ اسلام کا کوئی امتیازی نشان، حتیٰ کہ نام تک ان کے ساتھ لگا نہ رہے۔ یا پھر شودر بن کر رہیں۔

ہمارے اس بیان کو مبالغہ نہ سمجھیے۔ ایک طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عملی زندگی میں امتیاز کا تو یہ حال ہے کہ ہر جگہ ہندو کی نظر ہندو پر اور مسلمان کی نظر مسلمان ہی پر پڑتی ہے، خواہ انتخاب کا معاملہ ہو، یا ملازمت کا، یا لین دین کا۔ اور دوسری طرف ہندو قوم جو کثیر التعداد بھی ہے، اور انگریزی سلطنت کی مشفقانہ عنایات سے ڈیڑھ سو برس کے مسلسل ترجیحی سلوک کی بدولت زندگی کے ہر شعبے پر پہلے ہی سے قابض ہو چکی ہے، نہایت معصومانہ ہوشیاری کے ساتھ ہم سے یہ کہتی ہے کہ آؤ اس ہمہ گیر امتیاز کو غیر موجود فرض کر کے ہم اور تم ایک قوم بن جائیں اور تم اسٹیٹ میں اپنے الگ حصہ کا مطالبہ چھوڑ دو۔ اس بات کو اگر مان لیا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ عملاً تو امتیاز قائم رہیگا مگر اسکو روکنے والی کوئی طاقت موجود نہ رہیگی بلکہ مزاحمت کو منافیِ قومیت قرار دے کر دبا دیا جائیگا۔ رفتہ رفتہ اسٹیٹ کے اقتدار سے مسلمان بے دخل کر دیئے جائینگے، اور زیادہ سے زیادہ پچاس سال میں نوبت اُسی حد تک پہنچ جائیگی جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ ہندوستان کی پوری آبادی میں ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک اور جہلاء سے لیکر بہترین تہذیب یافتہ لوگوں تک یکساں پھیلی ہوئی ہے۔

کلکتہ یونیورسٹی جیسے بلند ترین تہذیبی ادارے میں بھی امتیاز کا یہ حال ہے کہ سنیٹ کے ۱۰۰ ممبروں میں سے صرف ۱۲ مسلمان ہیں، سنڈیکیٹ کے سترہ ارکان میں صرف ایک مسلمان بار پا سکا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۸۰ سال کی طویل مدت میں صرف ایک مسلمان کو وائس چانسلری کا عہدہ مل سکا ہے، دفتری اسٹاف کے ۸۰ ممبروں میں صرف دو مسلمان ہیں اور تعلیمی اسٹاف کے ۸۰ ارکان میں بھی مسلمان دو سے زیادہ نہیں ہیں۔ آج شاید کوئی انتہا درجہ کا ہٹ دھرم آدمی بھی اسکی یہ توجیہ نہ کرسکے گا کہ لائق مسلمان ملتے ہی نہیں۔ اسکی وجہ بجز قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کے اور کچھ نہیں بتائی جاسکتی۔ اور اسکے ساتھ ہمسایہ قوم کے جذبات بلکہ اسکی عزت تک سے انتہائی سنگدلانہ بے پروائی کا یہ حال ہے کہ بی۔ اے کے نصاب میں بنگالی زبان کا ایک ناول (دیوی چودھرانی) پڑھایا جاتا ہے جس میں مسلمانوں کو کھلے کھلے الفاظ میں چور، بدمعاش، کمینہ اور بزدل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن ان روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ادارہ ہے، جو ملک کے آئندہ لیڈر بننے والے ہیں۔ اس ادارہ میں بھی جب عہدہ داروں کے انتخاب کا سوال آیا تو ہندو اکثریت کی نظر ہر عہدے کیلیے ہندو ہی پر پڑی۔ چنانچہ ۳۶ء میں ایک بھی مسلمان انکو اس قابل نہ ملا جو کسی عہدے کیلیے منتخب کیا جاتا۔ بعد میں بعض مسلمانوں کو بھی موقع دیا گیا، مگر وہ صرف ایسے مسلمان تھے جن کے نامسلمان ہونیکا پوری طرح اطمینان کرلیا گیا تھا ــــ زیادہ سے زیادہ وسعت قلب جس کا اظہار کیا جاسکتا ہے وہ بس اتنی ہی ہے کہ ہندو کے بعد نظر انتخاب کسی ایسے "مسلمان" پر جاکر ٹھیر جائے جو اعمال، خیالات، جذبات، غرض کسی حیثیت سے بھی مسلمان نہ پایا جاتا ہو ــــ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کسی ادارے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو تو وہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں۔ انکے درمیان قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ کوئی باہر سے لگی ہوئی چھوت نہیں ہے، بلکہ اندر سے ابھرنے والا جذبہ ہے جو اس وقت تک فنا نہیں ہوسکتا جب تک ہندو، ہندو کی حیثیت سے اور مسلمان، مسلمان کی حیثیت سے فنا نہ ہوجائے۔ قیاس نہیں بلکہ واقعات سے ثابت ہے، کہ یہی صورت حال ہر اس انتخاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عام میں پیش آئی ہے، جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر ووٹ دیا ہے۔ ایسے انتخاب میں لازمی طور پر ہندوؤں کی ۹۹ فیصدی تعداد کو اپنی نمائندگی کے قابل صرف ہندو، اور مسلمانوں کی ۹۹ فیصدی تعداد کو اپنی نمائندگی کے قابل صرف مسلمان ہی نظر آتا ہے۔ منٹو مارلے ریفارم سے پہلے جب کہ انتخابات مخلوط تھے، کبھی کوئی مسلمان کسی حلقے سے کامیاب نہ ہو سکا، اور حکومت کو ہمیشہ نامزدگی کے طریقے سے مسلمانوں کی نمائندگی کا انتظام کرنا پڑا۔ انڈین نیشنلزم کے دور میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اجمیر کے مخلوط حلقۂ انتخاب سے تو آج تک کوئی مسلمان اسمبلی میں گیا ہی نہیں، رہی دہلی، سو وہاں ہندو تو مہاسبھائی ٹائپ کے بھی کامیاب ہو سکتے ہیں، مگر مسلمان صرف آصف علی ٹائپ ہی کا کامیاب ہوتا ہے، اور وہ بھی ایک مرتبہ کی سخت ناکامی کے بعد۔

خود وہ جماعت جو "متحدہ قومیت" کی علمبردار بنی ہوئی ہے، اسکی جڑوں میں بھی یہی قومی امتیاز اور یہی ترجیح ہم جنس، آخری ریشے تک اتری ہوئی ہے۔ گئو رکھشا، ہندی اور اچھوت ادھار پر جان چھڑکنے والا گاندھی تو کانگریس کا مختارِ کل بن سکتا ہے، مگر مسلمانوں کے مفاد کا نام لینے والا محمد علی (علیہ الرحمہ) کانگریس کے دائرے میں بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ سخت مہاسبھائی ٹائپ کا ہندو بھی کانگریس میں ممتاز عہدوں پر فائز ہو سکتا ہے مگر مسلمان کیلیے وہاں ذمہ داری کے عہدوں پر پہنچنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ یا تو وہ ڈاکٹر محمود، ڈاکٹر خان، ڈاکٹر اشرف، اور رفیع احمد قدوائی کے ٹائپ کا ہو، یا پھر صبر و استقامت کے اس مرتبہ پر فائز ہو جس پر آجکل جناب مولانا ابوالکلام آزاد فائز ہیں، یعنی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے مشرف ہونیکے لیے وہ مسلمانوں کے مفاد کا نام تک زبان پر نہ لائے، اور ورکنگ کمیٹی میں وہی حیثیت قبول کرے جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانی ممبروں کی حیثیت ہے[1] ——— اس کی وجہ قومی امتیاز کے

[1] بلاشبہ ایک مسلمان کیلیے صبر و ثبات کا یہ مقام، امام (۲۲۱) احمد ابن حنبل اور گیلیلیو کے مقام صبر و ثبات سے بھی زیادہ اشد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوا اور کیا ہے؟ اس کا الزام تو برطانوی سامراج کے سر تھوپنے کی جرأت شائد پنڈت جواہر لال نہرو بھی نہیں کر سکتے۔

پھر اگر یہ قومی امتیاز کا نہیں تو اور کس چیز کا کرشمہ ہے کہ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر مسلمانوں کو ڈیلی گیٹ منتخب کرنے کیلیے پنڈت جواہر لال کو کانگریس کمیٹیوں کے نام ایک سفارشی گشتی (Circular.) بھیجنے کی ضرورت پیش آئی، اور پھر بھی بکثرت مقامات پر ہندو امیدواروں کے مقابلہ میں مسلمان امیدوار صرف اسلیے کامیاب نہ ہو سکے کہ ہندوؤں کی نظر انتخاب ——— ایسے موقع پر بھی جبکہ مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی شدید ضرورت تھی، اور صدر کانگریس اس ضرورت کی طرف توجہ بھی دلا چکا تھا ——— ہندوؤں ہی پر جا کر ٹھیرتی تھی۔ اور یہ قومی امتیاز نہیں تو اور کیا ہے کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں نام نہاد مسلمانوں کے گروہ سے بھی کوئی وزیر اعظم نہ بن سکا، اور ایسے مسلمان کو وزارتِ عظمیٰ کا منصب صرف اس صوبہ میں حاصل ہوا جہاں مسلم اکثریت ہے۔ اسیطرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں کٹے قوم پرست مسلمانوں کو بھی اسمبلی کی صدارت نہ مل سکی۔ اور وزارتوں اور پارلیمنٹری سکرٹریوں میں بھی آبادی کے اسی تناسب کو ملحوظ رکھا گیا جو کہا جاتا ہے کہ صرف "فرقہ پرست" ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور حتی الامکان کوشش کی گئی کہ اہم ترین شعبے کسی نام نہاد مسلمان تک کے اختیار میں نہ جانے پائیں۔ اور یہ قومی امتیاز نہیں تو اور کیا ہے کہ یو۔ پی اور بہار میں کسانوں کے جن حقوق کی پر زور حمایت کی جاتی ہے، بنگال میں انہی حقوق کے خلاف کھلی اور چھپی ہر قسم کی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں، حتیٰ کہ بنگال کانگریس کمیٹی کا سرکاری آرگن (Advance.)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۲۔ ہے، اگرچہ ارفع نہیں۔ اسلیے کہ وہاں جسمانی مصیبت کے ساتھ کم از کم ضمیر کا اطمینان تو تھا، اور یہاں بر بنائے حسن ظن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بھی میسر نہیں۔ اسی بنا پر جناب مولانا نے گذشتہ عید اضحیٰ کے خطبہ میں اپنے اس صبر و ثبات پر فخر فرمایا۔ گو یہ چیز اس شخص کیلیے قابل فخر نہیں جو کبھی ابن تیمیہ اور اسماعیل شہید کے منصب کا امیدوار تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صاف لکھ دیتا ہے کہ :

"زمینداروں کی اکثریت ہندو ہے اور کسانوں کی اکثریت مسلمان ہے۔ بنگال کے قانون کاشتکاران کا مسودّہ ، ہمیں خوف ہے کہ اس صوبہ میں ہندوؤں کے باقی ماندہ اثر پر ایک کاری ضرب ہوگا"

ایسی روشن مثالوں کی موجودگی میں یہ کہنے کیلئے کافی جسارت کی ضرورت ہے، کہ ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے یا ایک قوم بن چکی ہے ، یا ہندو اور مسلمان رہتے ہوئے ایک قوم بن سکتی ہے۔ یہ آفتاب سے زیادہ ظاہر ہے کہ اگر قومی امتیاز موجود رہے ، اور پھر اسکو غیر موجود فرض کر کے ہندوستان کی آئندہ سیاسی عمارت کا نقشہ بنایا جائے، تو اس میں صرف اس قوم کا فائدہ ہے جو تعداد میں زیادہ اور قوت و اثر کی جگہوں پر پہلے ہی سے قابض ہو، کیونکہ اس طرح وہ پوری کامیابی کیساتھ امتیاز برت کر قلیل التعداد اور کمزور قوم کو اسٹیٹ کی قانون بنانے والی اور قانون نافذ کرنے والی مشین سے بے دخل بھی کر سکتی ہے ، اور قومیت متحدہ کا نام لیکر ہر اس شخص کا منہ بھی بند کر سکتی ہے، جو مظلوم قوم کے حقوق کا دعویٰ لے کر اٹھے۔

قومیت کے اس اصول کو پوری طرح نتیجہ خیز بنانے کیلیے ڈیماکریسی کا انگریزی ماڈل اختیار کیا گیا ہے۔ باریک اصطلاحی مسائل کو چھوڑ کر، صاف اور سادہ الفاظ میں ڈیماکریسی کا خلاصہ یہ ہے کہ مجلس قانون ساز (Legislature.) میں تمام امور کا تصفیہ مجرّد اکثریت سے ہو، اور اقلیت اُس وقت تک بے اثر رہے ، جبتک وہ قوم کی رائے عام کو اپنا ہم خیال بنا کر اکثریت بن جانے میں کامیاب نہ ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں :-

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قابو میں رکھتی ہے" (میری کہانی۔ جلد دوم۔ صفحہ ۴۵۵)

اس نوع کی جمہوریت صرف اس ملک کیلیے مناسب ہوسکتی ہے جہاں ایک قوم رہتی ہو، جہاں کے باشندوں میں، تہذیب و تمدن، اصول معاشرت، اور نظریہ حیات کے اساسی اختلافات نہ ہوں، اور جہاں مختلف گروہوں کے مفاد چاہے کتنے ہی مختلف ہوں، مگر ان کے درمیان اجتماعی زندگی میں کوئی امتیاز نہ ہو، یا کم از کم اس حد تک پہنچا ہوا امتیاز تو نہ ہو کہ ایک گروہ کا آدمی دوسرے گروہ والے کے ہاتھ سے پانی تک پینا گوارا نہ کرے۔ ایسے ملک میں اولاً تو کوئی اکثریت دوامی اکثریت (Permanent majority.) نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہاں ہر جماعت کیلیے رائے عام کو اپنا ہم خیال بنا کر اکثریت میں آجانا ممکن ہے۔ ثانیاً خواہ کوئی جماعت بھی ایسے ملک میں برسرِ اقتدار ہو، بہر حال اس سے قلیل التعداد جماعتوں کو یہ خوف نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنی قانون سازی، اور تنفیذ قانون کی پالیسی سے انکی قومیت کی اساس پر ضرب لگائیگی، کیونکہ وہاں قومیت تو ایک ہی ہے، اختلافات جو کچھ ہیں محض سیاسی اور معاشی نظریات کے ہیں یا فروعی اغراض و مفاد کے۔

برعکس اسکے ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک قوم فرض کرنا، اور پھر اس مفروضہ کی بنا پر ڈیماکریسی کے اس نمونہ کو یہاں رواج دینا، یہ معنی رکھتا ہے کہ یہاں کی قلیل التعداد قوموں پر ایک کثیر التعداد قوم کے امپیریلزم کو مسلط کردیا جائے۔ اسلیے کہ یہاں اکثریت بہر حال دوامی اکثریت ہے۔ کوئی اقلیت، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، یا ہندوؤں کی، اپنے آپ کو اس وقت تک اکثریت میں تبدیل نہیں کرسکتی جب تک کہ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں میں، یا مسلمانوں کو ہندوؤں میں تبدیل نہ کردے۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے مختلف طبقوں میں معاشی اغراض و مفادات کسی حد تک مشترک ضرور ہیں مثلاً یہ ضرور ممکن ہے کہ ہندو کسان اور مسلمان کسان کا معاشی مفاد ایک ہو، یا ہندو مزدور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مسلمان مزدور کی اغراض یکساں ہوں، مگر اول تو صرف معیشت ہی ایک چیز نہیں ہے جو انکی زندگی میں اہمیت رکھتی ہو، بلکہ اس سے اہم تر چیزیں دوسری ہیں جنکے امتیاز و اختلاف نے معیشت کے میدان میں بھی انکے مفادات مختلف کر دیے ہیں۔ یہو سکے ہندو اور مسلمان، دونوں قوموں کے مالداروں سے مال چھیننے میں متفق ہو سکتے ہیں، مگر مال چھیننے کے بعد جب اسے تقسیم کرنیکا سوال سامنے آئیگا تو ہندو، ہندو کو ترجیح دیگا، اور مسلمان مسلمان کو۔ ثانیاً اگر ان کا معاشی مفاد بالکل یکساں ہو، تب بھی کوئی مسلمان اپنی زندگی کے سارے معاملات ہندو کو، اور اسی طرح کوئی ہندو اپنی زندگی کے سارے معاملات مسلمان کو محض اس وجہ سے نہیں سونپ سکتا کہ روٹی کے معاملہ میں دونوں کا مفاد یکساں ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ دوسری قوم کا آدمی اسکے مذہبی یا تمدنی یا تعلیمی مسائل کا جسطرح چاہے تصفیہ کر دے۔ ایسی حالت میں محض روٹی کا نام لیکر یہ کہنا کہ ہندو عوام اور مسلمان عوام کے مفاد یکساں ہیں، اسلیے دونوں ایک قوم ہیں، اور دونوں، انگریزی نمونہ کے مطابق ایک ڈیماکریٹک نظام حکومت کو قبول کر سکتے ہیں، صریح دھوکہ بازی ہے، اور اس دھوکہ بازی میں قومی استعلاء (National Aggrandisement.) کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ ایسے ڈیماکریٹک نظام حکومت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ کثیر التعداد قوم، حکومت کے اقتدار پر کلیتہً قابض ہو کر، اور اپنی تعلیمی پالیسی، اپنی قانون سازی، اور تنفیذ قانون کی مشینری سے قلیل التعداد قوموں کے مذہبی عقائد، انکی ذہنیت، انکے نظریات و افکار اور انکے اصول تمدن و معاشرت کو اپنے حسب منشا بدل کر، رفتہ رفتہ اپنی قومیت میں جذب کر لے، اور اگر اس طرح وہ جذب ہونا قبول نہ کریں تو معاشی امتیاز کی پالیسی اختیار کر کے انکو اس قدر تنگ کرے کہ وہ جذب ہونے پر مجبور ہو جائیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈیماکریسی کا یہ نظریہ کس طرح کام کر رہا ہے، اسکا اندازہ ذیل کی چند مثالوں سے کیا جاسکتا ہے:-

سنٹرل اسمبلی میں مسٹر داس کا مسودۂ قانون (جسکی رو سے شاردا ایکٹ کو اور زیادہ سخت کردیا گیا ہے) مسلمانوں کی قریب قریب متفقہ مخالفت کے باوجود، مجرد اکثریت سے پاس کردیا گیا۔

بمبئی اسمبلی میں میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کیلیے مخلوط انتخاب کا قانون، جس میں مقامی مسلمانوں کو بطور خود مخلوط حلقہائے انتخاب میں شریک ہونے کا اختیار دیا گیا تھا، مجرد اکثریت سے پاس کیا گیا درانحالیکہ مسلمان ارکان کی عظیم اکثریت نے اسکی مخالفت کی تھی۔

مدراس اسمبلی میں محض اکثریت کے زور پر ایک مدت تک بندے ماترم کا گیت گانے کا سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں کو اسکے لیے قیام تعظیمی پر مجبور کیا جاتا رہا۔ حتی کہ اختلاف کرنے والے مسلمانوں کو کرسی صدارت کی طرف سے علانیہ دھمکیاں تک دی گئیں۔

سی پی میں ودیا مندر کی اسکیم مسلمانوں کی متفقہ مخالفت کے باوجود منظور کی گئی اور مجلس نصاب میں ایک مسلمان بھی شریک نہ کیا گیا۔

مدراس اور بمبئی میں اقلیت کی مخالفت کے باوجود محض اکثریت کے زور پر ہندی کو زبردستی رائج کیا جارہا ہے (اسکے لیے لفظ "ہندوستانی" کا پردہ ان حضرات کو خوب مل گیا ہے جس سے باہر کے لوگ ایک مدت تک اسی دھوکے میں رہتے ہیں کہ شائد اردو اور ہندی دونوں کو رواج دیا جارہا ہوگا)

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیماکریسی کے خوشنما پردے کو آڑ بنا کر دراصل اقلیت پر اکثریت کا استبداد قائم کیا جارہا ہے۔ ایک قوم صرف اس بنا پر کہ اسکی تعداد زیادہ ہے، اپنے آپکو اسکا حقدار سمجھتی ہے کہ دوسری قوم پر جس قانون اور جس طریقہ کو چاہے مسلط کردے، خواہ وہ اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔ اسوقت تک اس استبداد کی رفتار سست ہے، کیونکہ مسلمانوں کو ابھی پوری طرح پھانسنے میں کامیابی نہیں ہوئی ہے، اور اس سے پہلے انکو بھڑکا دینا خلاف مصلحت سمجھا جارہا ہے۔ لیکن اگر خدا نے ہم کو عقل دی ہے، تو ہم اب بھی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ڈیماکریسی کا یہ نظریہ

© rasailojaraid.com